# منیر نیازی کی شاعری: چند جہات

طارق ہاشمی
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

# A STUDY OF MUNIR NIAZI'S VERSE

Tariq Hashmi, PhD
Assistant Professor of Urdu, GCU, Faisalabad

**Abstract**

Munir Niazi is a prominent modern poet of Urdu language. He has a creative command over both genres of Ghazal and Nazm. His poetry is appreciated because of his unique and bold style. He has employed, time and between, element of personification in his poetry very beautifully. The usage of personification has made him a poet of different kind. Some mythological symbols have a cultural meaning in his poems. Munir Niazi is an idealist. He seems to be in search of a man through his verse who can fight against ugliness of the society and endeavors to promote aesthetic values.

**Keywords:**

اردو، نظم، تنقید، منیر نیازی، انسان، شاعری، انگارے، لشکر، رات، انتظار حسین

اُردو نظم کے ارتقائی سفر میں جہاں اُن شعرا کا تخلیقی سرمایہ لائقِ اہمیت ہے جو خود کو کسی خاص نظریے یا گروہ سے وابستہ کر کے ایک قافلے کا حصہ تھے تو وہاں بعض ایسے شعرا کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو اس سفر میں قطعی طور پر علیٰحدہ یا قدرے الگ ہو کر چل رہے تھے۔

اِن شعرا کا کسی قافلے کا حصہ نہ بننے یا اُس سے الگ ہو جانے کے کئی ایک اسباب ہو سکتے ہیں۔ مخصوص نظریے سے اختلاف یا اُس نظریے کے علمبرداروں کی راسخ العقیدگی کے باعث کچھ اہلِ قلم کی عدم قبولیت، انفرادیت پسندی یا نظریاتی وابستگی کے باوجود بعض زمانی حقائق کے باعث کسی گروہ سے الگ رہنے کا خیال۔ اس کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ممکن ہے کہ بعض شعرا ایک ایسے وقت میں اپنی تخلیقی شناخت بناتے ہیں جب ایک نظریہ اپنی طبعی عمر پوری کرنے کو ہوتا ہے جبکہ دوسرا کوئی نظریہ ابھی پاؤں پاؤں چلتا دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا ایسے شعرا تاریخِ ادب میں کسی مخصوص گروہ یا نسل میں شمار نہیں کیے جا سکتے۔

آزادطور پر تخلیقی سفر جاری رکھنے کا مذکورہ شعرا کو اپنی شناخت کی بقا کے سلسلے میں فائدہ بھی ہوا اور نقصان بھی۔ فائدہ اپنی الگ تخلیقی پہچان کا جبکہ نقصان یہ کہ بعض وہ شعرا جو تخلیقی طور پر اتنی پائیداری نہیں رکھتے تھے مگر نظریاتی وابستگی کے باعث ناقدین نے اُن پر اتنا لکھا کہ آزادطبع تخلیق کار قدرے پس منظر میں چلے گئے۔

اردو تنقید کا یقیناً یہ ایک المیہ رہا ہے کہ اُس نے متن سے زیادہ نظریہ یا ادبی فضا میں تخلیق کار کے بارے میں عام تاثر کو زیادہ اہمیت دی، جس سے تاریخِ ادب کے مدوجزر کو سمجھنے میں آج بہت سے اُلجھاؤ موجود ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر الگ طور پر لکھے جانے کی ضرورت ہے۔

منیر نیازی کا شمار بھی اُردو شاعری کی ان ہستیوں میں ہوتا ہے جو کسی تحریک یا مخصوص رجحان سے وابستہ گروہ سے منسلک نہیں رہی ہیں۔ اُن کی شاعری کے میلانات کو دیکھا جائے تو فکری و فنی سطح پر تین رجحانات بہت واضح دکھائی دیتے ہیں۔ فکری طور پر اُن کے ہاں ایک مثالی انسان کی جستجو ایمائی پیرائے میں نظر آتی ہے جبکہ فنی اور اسلوبیاتی لحاظ سے اُن کی شاعری میں بنائے گئے کردار اور غزل میں تمثالی پیرایہ لائقِ توجہ ہے۔

جہاں تک منیر کے تصورِ انسان کا تعلق ہے تو اُن کی نظموں میں نہ تو کسی شہری ماحول کی تمثال

ہے نہ ہی انسانی زندگی کا کوئی ایسا عکس کہ جس میں فرد کی بے بسی اور کرب کو ظاہر کیا گیا ہو۔ بلکہ جنگل کی فضا اور اس سے متعلق علامات کے ذریعے اُس خوف کو اجاگر کیا گیا ہے کہ جس سے عصری انسان دوچار ہے۔ منیر نے ایک واحد متکلم کے کردار اور اُس کے باطن میں تاریک ماحول کے خوف کو اس طرح نظم کیا ہے کہ نفسِ مضمون کی تاثیر ایک الگ پیرایۂ اظہار میں ظاہر ہوتی ہے۔

پھر گھایل چیخوں نے مل کر دہشت سی پھیلائی
رات کے عفریتوں کا لشکر مجھے ڈرانے آیا
دیکھ نہ سکنے والی شکلوں نے جی کو دہلایا
ہیبت ناک چڑیلوں نے ہنس ہنس کر تیر چلائے
سائیں سائیں کرتی ہوا نے خوف کے محل بنائے (۱)

---

جس کے کالے سایوں میں ہے وحشی چیتوں کی آبادی
اس جنگل میں دیکھی میں نے لہو میں لتھڑی اک شہزادی
اس کے پاس ہی ننگے جسموں والے سادھو جھوم رہے تھے
پیلے پیلے دانت نکالے نعش کی گردن چوم رہے تھے
ایک بڑے سے پیڑ کے اوپر کچھ گدھ بیٹھے اونگھ رہے تھے
سانپوں جیسی آنکھیں میچے خون کی خوشبو سونگھ رہے تھے (۲)

منیر نیازی کی درج بالا نظمیں اس کی شاعری میں تخلیق پانے والے فضا کی عکاس ہیں جس میں خوف، دہشت اور ہیبت ماحول پر چھائی ہوئی ہے۔ اس قدر خاموش اور تاریک فضا میں جب کوئی آہٹ یا سرسراہٹ پردۂ سماعت سے ٹکراتی ہے تو پورا وجود لرزنے لگتا ہے اور پھر ہر طرف رات کے عفریتوں کے لشکر ڈرانے لگتے ہیں۔ ہیبت ناک چڑیلیں اپنے میلے اور لمبے دانت نکالے جسم نوچنے کو آگے بڑھتی ہیں۔ پیلے منہ اور وحشی آنکھوں میں سرخ انگارے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تنہا آدمی کا وجود خوف سے لرزاں ہو جاتا ہے۔ ہر طرف ننگے جسموں والے سادھو جھوم رہے ہیں۔ تنہا آدمی اپنے

بچاؤ کے لیے دوڑتا ہے تو ہیبت ناک چڑیلیں ہنستی ہیں، چیختی ہیں، تنہا آدمی کو بھوت راستہ نہیں دیتے۔ اس کا ایک سہارا درخت ہے جس کی شاخوں پر بیٹھ کر وہ ان وحشی بھوتوں سے بلند ہو جاتا ہے۔ مگر اس محلِ اماں کی شاخوں پر بھی گدھ آنکھیں میچے خون کی خوشبو سونگھ رہے ہیں۔

منیر نیازی کی نظموں کا یہ ماحول محض داخلی کیفیات کا مظہر نہیں بلکہ خارج کا منظر نامہ ہے۔ منیر کی نظم میں وحشی جانور، بھوت، چڑیلیں، عفریت اور بلائیں اس کے خوف کی اٹھتی ہوئی لہریں وہ انسان ہیں کہ مکروہ اعمال کے باعث جن کے چہرے خوفناک عفریتوں جیسے ہو گئے ہیں۔ انسان نے زمین پر اس قدر ظلم کیا ہے اور کشت وخوں کے دریا بہائے ہیں کہ اب شرف انسانیت پر عز وناز کا اظہار ایک بے ہودہ کلمہ لگتا ہے۔ منیر نیازی ایک تنہا شخص کی طرح اس وحشی اور پر ہول ماحول میں انسان کی آرزو کرتے ہیں۔ پھر وہ کسی برگد کے تلے کسی غار میں بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ اس وحشی ماحول میں رونق کیسے پیدا کی جائے۔ انسان کو کہاں تلاش کیا جائے۔

منیر نے انتظار حسین کے ساتھ ایک مکالمے میں ظلم کرنے والی اِن طاقتوں کو زمین پر خبیث قوتیں قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''میں چنگیز خان کی طرح کا آدمی نہیں چاہتا۔ ایسے خدا پرست لوگ دیکھنا چاہتا ہوں جن کے یہاں احساسِ جمال اتنا ہو کہ خبیث قوتیں اُس کے رعب میں آجائیں۔۔۔ میں بھی اپنی شاعری سے ایسے ہی آدمی تیار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''(۴)

جس فرد کی تیاری کی بات منیر نیازی نے کی ہے اُس کی جستجو کا سفر بھی منیر کی شاعری میں کئی ایک جگہ ملتا ہے۔ مگر جس طرح شاعر نے خبیث قوتوں کی تمثالیں اپنے ایک الگ انداز میں تراشی ہیں، اسی طرح صالح اور خیر کی قوتوں کے علمبردار افراد کی تلاش کے مراحل بھی ایک مختلف پیرائے میں ملتے ہیں۔ منیر کی نظمیں 'ویران درگاہ میں آواز' اور 'صدا بصحرا' کو اگر اس تناظر میں دیکھا تو یہ ایک مختلف اور منفرد معنویت کے ساتھ کھلتی ہیں:

چاروں سمت اندھیرا گھپ ہے اور گھٹا گھنگور
وہ کہتی ہے۔۔''کون؟''

میں کہتا ہوں۔۔۔''میں''

کھولو یہ بھاری دروازہ

مجھ کو اندر آنے دو''

اس کے بعد اک لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور(۴)

منیر نیازی کو بھی کوشش بے سود کے بعد یقین ہوتا ہے کہ واقعی کوئی نہیں۔وہ انسان جس کی آرزو تھی اس ماحول میں نہیں ہے۔وہ کسی ان دیکھی دنیا میں چلا گیا ہے اور اب شہروں میں محض وہم رہ گیا ہے،خوف رہ گیا ہے۔ہر طرف ایک سناٹا طاری ہے۔

منیر نیازی شہر او بام کے مکانوں میں بے روح انسانوں کا دکھ بھی رکھتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ اُن باہمی رویوں میں تبدیلی کی تمنا بھی رکھتے ہیں، جو ان دکھوں کا باعث ہیں۔ یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ منیر کے ہاں برائی سے شدید نفرت کا جذبہ موجود ہے لیکن اُس کا اظہار ایک خاص دھیمے مگر پر اثر انداز میں ہوا ہے۔وہ برائی کے خلاف کسی کھلی تبلیغ کے بجائے نیک رویوں کے حسن و جمال کا تمثال اور اُس کے رنگوں کے امتزاج کے ذریعے عمل منیر کے تسلسل میں توجہ دیتے ہیں۔کہیں کہیں مزاحمت کا رنگ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن مجموعی طور پر وہ صالح ماحول کے لیے آرزو اور ایسے ماحول کی تشکیل کے لیے کوشاں لوگوں کے لیے دعا کا رویہ اختیار کرتے ہیں:

ایک نگر ایسا بس جائے جس میں نفرت کہیں نہ ہو

آپس میں دھوکا کرنے کی، ظلم کی طاقت کہیں نہ ہو

اس کے مکیں ہوں اور طرح کے، مسکن اور طرح کے

اس کی ہوائیں اور طرح کی گلشن اور طرح کے(۵)

منیر نیازی نے اپنے مثالی انسان کی تلاش کے لیے ایک مثالی نگر کی تمثالیں بھی تراشی ہیں اور معاصر انسانی رویوں پر طنز و تعریض کے لیے بہت عمدہ کردار بھی تشکیل دیے ہیں۔اس سلسلے میں اُن کی وہ نظمیں زیادہ توجہ کھینچتی ہیں جو ۴۷ء کے فسادات کے پس منظر میں تخلیق کی گئی ہیں۔مذکورہ فسادات اور ہجرت کے تجربے پر منیر نے بہت گہری نظمیں تخلیق کیں۔جن میں سے بعض میں،بہت عمدہ کردار بھی

ملتے ہیں۔ ان کرداروں میں منیر نے خارجی منظر نامے کے ساتھ ساتھ فرد کی داخلی اور نفسیاتی گہرائیوں کو بھی گرفت میں لیا ہے۔

نظم میرے دشمن کی موت' میں ایک قاتل کی داخلی خود کلامی کو نظم کیا گیا ہے۔ جس نے ۴۷ء کے فسادات کے دوران میں اپنے مخالف نظریے کے آدمی کا خون کیا۔ لیکن جب اس نے قتل کر لیا تو اس کے اندر احساس گناہ نے جنم لیا۔ یہ احساس گناہ اتنا شدید ہے کہ ندامت اور حسرت واندوہ کا اس پر غلبہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس کا ضمیر اسے جھنجھوڑتا ہے کہ کاش اس نے ایسا نہ کیا ہوتا۔

اختر الایمان کی نظم 'ایک سوال' میں بھی قاتل و مقتول کے کردار ان فسادات کے پس منظر میں ملتے ہیں لیکن منیر کے ہاں فکر اور تاثر کی گہرائی بہت پختہ ہے، مذکورہ نظم میں قاتل کی خود کلامی اس کربناک لمحے کی پوری تصویر کھینچتی ہے جب اس نے مقتول پر تلوار چلائی تھی۔ قتل کے وقت مقتول کی آنکھوں میں حسرت واندوہ کا غلبہ تھا، وہ قاتل کو تک رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میرا قتل نہ تو میرے کسی جرم کی بدولت ہے نہ ہی اس شخص نے مجھے کسی ذاتی دشمنی کی بنا پر قتل کیا۔

نظم کے آخر میں قاتل اپنے اور مقتول کے بارے میں سوچتا ہے کہ آخر میں کون ہوں اور وہ کون تھا، یہ استفہام کسی بیگانگی یا اجنبیت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ایک گہری آشنائی کے باعث ہے۔ یہ قاتل کا تجاہل عارفانہ ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں کون ہوں اور مقتول کون تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے ساتھ اس نے نسل در نسل ایک جگہ پر سانس لیا لیکن ۴۷ء کے فسادات کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس وقت دونوں نظریوں کے حامل لوگوں نے صدیوں کا ساتھ اپنی وحشت اور بربریت کی نذر کر دیا تھا۔ اس وقت بس ایک ہی جنون سوار تھا کہ تلوار چلا دو۔ گولی مار دو۔ اس نظم کا مرکزی کردار (قاتل) ضمیر کی اس کسک اور ملامت کا اظہار ہے جس نے فسادات کے بعد دونوں طرف جنم لیا۔ 47ء کے فسادات میں قتل و غارت گری اس قدر بڑھ گئی کہ ماحول میں ہر طرف وحشت چھا گئی، منیر نے اس وحشت کا اظہار بڑی عمدگی سے کیا ہے، نظم 'آسیبی رات' کا مرکزی کردار اسی وحشت کا شکار ایک شخص ہے۔ اس کے گھر میں اس کی عورت (لیلیٰ) رات ہو جانے پر بھی واپس نہیں آئی تو وہ اس کی تلاش میں نکلتا ہے:

لالٹین کو ہاتھ میں لے کر جب میں باہر نکلا
دروازے کے پاس ہی اک آسیب نے مجھ کو ٹوکا

آندھی اور طوفان نے آگے بڑھ کر رستہ روکا
تیز ہوا نے روکے کہا تم کہاں چلے ہو بھائی
یہ تو ایسی رات ہے جس میں زہر کی موج چھپی ہے
جی کو ڈرانے والی آوازوں کی فوج چھپی ہے(۶)

یہ تیز ہوا آسیب، آندھی اور طوفان دراصل مرکزی کردار کا خوف ہے۔ جسے وہ دبا دیتا ہے اور لیلیٰ کی تلاش میں آگے بڑھتا ہے۔لیکن جونہی وہ آگے بڑھتا ہے تو:

میں نے جیسے خواب میں دیکھا اک خونیں نظارا
جس نے میرے دل میں گہرے درد کا بھالا مارا
خون میں لت پت پڑی ہوئی تھی اک ننگی مہ پارا(۷)

وہ جب یہ منظر دیکھتا ہے تو خوف سے اس کے وجود پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔شاعر نے اس کے داخلی خوف کی تمثال، بہت عمدگی سے دکھائی ہے:

پھر گھائل چیخوں نے مل کر دہشت سی پھیلائی
رات کے عفریتوں کا لشکر مجھے ڈرانے آیا
دیکھ نہ سکنے والی شکلوں نے جی کو دہلایا
ہیبت ناک چڑیلوں نے ہنس ہنس کر تیر چلائے
سائیں سائیں کرتی ہوا نے خوف کے محل بنائے(۸)

اس خوف نے اسے گنگ کر دیا، اس کی قوت گویائی پر جبر طاری ہونے لگا تو اس کے داخل سے ایک چیخ ابھری۔عفریتوں نے کردار کی پکار کو اس پر ایک وحشیانہ طنز کیا ہے۔ننگی مہ پارہ کا لت پت جسم اور کردار کو لیلیٰ کی جانب سے جواب نہ ملنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگلے قدم پر وہ بھی اسی انجام سے دو چار ہو چکی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وقت کے عفریت اس کی پکار پر ہنستے ہیں۔

منیر کے ہاں آسیب اور اس سے وابستہ عناصر،عفریت، چڑیلیں، گدھ اور خوفناک درندے، اس وحشت اور خوف کی علامتیں ہیں جن کا شکار ۴۷ء کے سانحہ میں متعدد لوگ ہوئے۔ہجرت کے اس

کربناک تجربے کے دوران میں عورتوں پر کیا بیتی، ان کی عصمتیں کس وحشت کا شکار ہوئیں، اس کا اظہار نظم 'جنگل کا جادو' کا مرکزی کردار ایک شہزادی کرتی ہے:

جس کے کالے سایوں میں ہے وحشی چیتوں کی آبادی
اس جنگل میں دیکھی میں نے لہو میں لتھڑی اک شہزادی
اس کے پاس ہی ننگے جسموں والے سادھو جھوم رہے تھے
پیلے پیلے دانت نکالے نعش کی گردن چوم رہے تھے
ایک بڑے سے پیڑ کے اوپر کچھ گدھ بیٹھے اونگھ رہے تھے
سانپوں جیسی آنکھیں میچے خون کی خوشبو سونگھ رہے تھے(۹)

نظم میں 'شہزادی' کا کردار وہ عورت ہے جس کی عصمت بربریت کا شکار ہوئی، ننگے جسموں والے سادھو وہ کردار ہیں جو اس بربریت کے مرتکب ہوئے۔ منیر نے اس بربریت کی تصویر خاص طور پر دکھائی ہے۔

نظم 'صدا بصحرا' اور 'ویران درگاہ میں آواز' کے کردار بھی ان فسادات کے خوف اور کرب کے ظاہر کرتے ہیں، اس طرح 'سپیرا' اور 'جادوگر' کے کرداروں کی تشریح بھی اسی جہت سے کی جا سکتی ہے۔

ان فسادات کا ایک اور منظر نظم 'گم شدہ ننھا بچہ' کا معصوم کردار بھی کرتا ہے جو ایک مہاجر قافلے میں ایک تاریک رات میں اپنے باپ سے بچھڑ گیا تھا۔

منیر کی نظم 'بیراگی سے مکالمہ' کا کردار بیراگی بھی انہی حالات کا شکار ایک شخص ہے جو اپنی زندگی کو تیاگ دیتا ہے۔

منیر نیازی کی شاعری کا تیسرا اہم حوالہ اُردو غزل میں اُن کا تمثالی پیرایہ ہے۔ اردو غزل کی تشکیلِ جدید کے سلسلے میں منیر نیازی کا تمثالی اسلوب اپنے تنوع اور فراوانی کے باعث جہت نما حیثیت کا حامل ہے۔ منیر نے اپنے اشعار میں تمثال کاری کے تجربات اور اُس کے امکانات سے بھرپور استفادہ کیا۔ یہ تصویریں کہیں تو محض عشق کے رومانی جذبات واحساسات کی ترجمان ہیں تو کہیں ان کی وسعت آفاق کی شش جہات تک پھیلی ہوئی ہے۔

ان تمثالوں کی بنیادی خصوصیت رنگوں کی حیرت انگیز فراوانی ہے ایسے لگتا ہے جیسے رنگ کی تخلیق میر کا شعری مشغلہ ہے اور وہ اس سلسلے میں مختلف تجربے کرتے رہتے ہیں:

شام کے رنگوں میں رکھ کر صاف پانی کا گلاس
آبِ سادہ کو حریفِ رنگِ بادہ کر دیا(۱۰)

شمس الرحمٰن فاروقی کے نزدیک ''رنگوں کا استعاراتی اشارہ میر کی شاعری کے لیے کلید کا کام کرتا ہے۔''(۱۱) اپنے دستِ ہنر سے وہ جب یہ کلید استعمال کرتے ہیں تو اُن کی شعری فضا میں ایک ایسا دکلر بکس' کھلتا ہے جس میں وہ رنگ بھی ہیں جو روزمرہ زندگی میں ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں اور وہ بھی جنھیں موسم تخلیق کرتے ہیں۔ ان میں وہ رنگ بھی ہیں جن سے انسانی بصارت سیر ہوتی ہے اور وہ بھی جن کی تشنگی ہر لحہ محسوس ہوتی رہتی ہے۔ عشق کی مختلف کیفیات کو مصور کرنے کے لیے بھی میر نے عجیب تحیر خیز تمثالیں تراشی ہیں۔ وصل کی سرخوشی اور سرمستی، جمالِ یار کے عکس اور قلب و جاں کی مختلف وارداتوں کی تصویر بندی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

آیا وہ بام پر تو کچھ ایسا لگا میر
جیسے فلک پہ رنگ کا بازار کھل گیا(۱۲)

---

میر پھول سے چہرے پہ اشک ڈھلکے ہیں
کہ جیسے لعل سم رنگ سے پگھلنے لگے(۱۳)

---

بہنے لگی ہے ندی، اک سرخ رنگ مے کی
اک شوخ کی لبوں کا لعلِ لیاغ چمکا(۱۴)

---

شاخِ گلِ انار کھلی بھی تو سنگ میں
وہ دل ترا ہوا یا لب خوں فشاں ہوا(۱۵)

---

ملائمت سے اندھیرے میں اُس کی سانسوں کے
دمک رہی ہیں وہ آنکھیں ہرے نگیں کی طرح (۱۶)

میں جو منیر اک کمرے کی کھڑکی کے پاس سے گزرا
اُس کے چق کی تیلیوں سے ریشم کے شگوفے پھوٹے(۱۷)

ان تمثالوں میں جہاں رنگ کی تخلیق کا باعث برسات ہے، شاعر کے لیے نشاط و انبساط کا فرواں سامان ہے۔ محبوب کا وصل اور موسم کے رنگ شاعر کے لیے خوشی کا سامان ہی نہیں ہیں بلکہ حیرت، دہشت، درد اور اداسی کے اسباب بھی ہیں۔ رنگِ جمال میں یہ احساس ملال ایک سوال ہے جس کے جواب کے طور پر وہ سماجی وجوہ بھی دیکھی جا سکتی ہیں "جن کی عائد کردہ صعوبتوں نے ایک تشنج کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔"(۱۸) اور شاعر کے داخل میں بعض نفسیاتی گرہوں کو بھی کھولنے کی سعی کی جا سکتی ہے:

شہر کی گلیوں میں گہری تیرگی گریاں رہی
رات بادل اس طرح آئے کہ میں تو ڈر گیا(۱۹)

حسن کی دہشت عجب تھی وصل کی شب میں منیر
ہاتھ جیسے انتہائے شوق سے شل ہو گیا(۲۰)

وہ رنگیلا ہاتھ میرے دل پہ اور اُس کی مہک
شمع دل بجھ سی گئی رنگ حنا کے سامنے(۲۱)

کوکتی تھی بنسری چاروں دشاؤں میں منیر
پر نگر میں اس صدا کا راز داں کوئی نہ تھا(۲۲)

'دشمنوں کے درمیان شام' اور 'ماہ منیر' میں جس نوع کی تمثالیں تراشی گئی ہیں، اردو غزل میں ایک نئے روحانی طرزِ احساس کے حوالہ سے ایک بالکل مختلف اور منفرد تجربے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دونوں کتابیں بالترتیب حضرت امام حسینؓ اور رسول کریمؐ کے نام معنون کی گئی ہیں۔

ان مجموعوں میں شامل غزلیں ایک خاص تجزیہی اسلوب کا تجربہ ہیں جن کے باطن میں حمد،

نعت اور منقبت کا آہنگ بھی موجود ہے۔ شاعر مذہب کے فلسفے اور طرز احساس کے تحت خدا اور خدا والوں کی مدح بھی کرتا ہے اور ان سے متصادم قوتوں پر طنز و تضحیک کے اشعار بھی کہتا ہے لیکن ان دونوں پہلوؤں کے متوازی وہ کائنات کی وسعتوں سے الگ ہو کر کائنات کا ایک وسیع خارجی مطالعہ و مشاہدہ بھی کرتا ہے جس میں حیات و موت زمانوں کا تسلسل اور شکست و ریخت کی تصویریں بھی ہیں:

متاعِ مہر منور دلوں سے پیدا ہو
متاعِ خواب مسرت غموں سے پیدا ہو
مثالِ قوسِ قزح، بارشوں کے بعد نکل
جمال رنگ کھلے منظروں سے پیدا ہو
فروغ اسمِ محمد ہو بستیوں میں منیؔر
قدیم یاد نئے مسکنوں سے پیدا ہو(۲۳)

---

زوالِ عصر ہے کوفے میں اور گدا گر ہیں
کھلا نہیں کوئی درباب التجا کے سوا(۲۴)

منیؔر کی تمثالوں میں کائنات کی ایسی تصویریں بھی ہیں جنھیں ایسا لگتا ہے جیسے کسی اور سیارے سے کھینچا گیا ہے۔ ان تصویروں میں صرف کرۂ ارض کے بحر و بر ہی نہیں بلکہ آفاق کی وسعتوں کے دیگر بے کراں مناظر بھی ہیں۔ یہ تصویریں کیمرے کی ساکن تصویریں نہیں ہیں بلکہ ایسی متحرک تمثالیں ہیں جن میں کائنات میں موجود مہ و مہر اور گردش سیار کا پورا نظام اپنے تحرک کا احساس دلاتا ہے۔ بقول سہیل احمد خان ''غزلوں کا یہ منطقہ ہمیں ایک نئی کونیات Cosmology سے دوچار کر رہا ہے۔'' (۲۵)

یہ تمثالیں ایک خواہش اور ادراک کا ثمر بھی ہیں۔ منیؔر کے نزدیک شعر کا تخلیقی عمل نامعلوم کی تلاش کا نام ہے اور ''شاعر عالم وجود کا شعور رکھنے والا اور عالمین ناموجود کی جستجو کرنے والا ہوتا ہے... اور شاعر مستقل مضطرب، مستقل آزردہ۔'' (۲۶) لیکن اس آزردگی کا مطلب دل گرفتگی یا مایوسی نہیں بلکہ ایک تخلیقی اضطراب ہے جو شاعر کو زمان و مکاں کے مسلسل مطالعے اور مشاہدے میں محو رکھتا ہے:

شہر، پربت، بحر و بر کو چھوڑتا جاتا ہوں میں
اک تماشا ہو رہا ہے دیکھتا جاتا ہوں میں
ابر ہے افلاک پر اور اک سراسیمہ قمر
ایک دشتِ رائیگاں میں دوڑتا جاتا ہوں میں(۲۷)

کائنات کے مطالعے کے بعد منیر جب اپنے تخلیقی باطن میں جھانکتے ہیں تو اس کون ضمیر میں نور کی ایسی مشعلیں روشن نظر آتی ہیں کہ مہ و مہر کی شمعیں جس کی خوشہ چیں ہیں:

تابشِ خورشید میرے جسم میں ہے اے منیر
چشمِ شب حیراں ہے میرے پرتو سیار سے(۲۸)

زمانوں کا تسلسل، تخریب و تعمیر اور فنا و بقا کا نظام منیر کے مطالعے میں آتا ہے تو سیم و زر سے آلودہ سود و زیاں کا کاروباری سلسلہ اپنے اندر عجیب عبرت خیزیاں سمیٹے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ ''لوگ خدائے ذوالجلال کو بھول کر خدائے اقتصادیات کی عبادت میں مشغول ہیں۔''(۲۹) تو منیر کی غزل کے پردے پر ایسی تصویریں نقش ہیں جن میں انسان کی مادی سوچ کی بوالعجبیوں کے عکس بھی ہیں اور اُس کے بھیانک انجام کے مظاہر بھی۔ یہاں منیر ترقی پسندوں کی طرح کسی جدلیاتی فلسفے کی تبلیغ نہیں کرتے نہ ہی کسی کو اُس کے انجام سے خبردار کر کے کوئی ہدایت نامہ جاری کرتے ہی بلکہ ویران بستیوں اور آگ کی تمثالیں تراش کر دہشت و ہیبت کے سامان بہم پہنچاتے ہیں:

اس شہرِ سنگ دل کو جلا دینا چاہیے
پھر اس کی خاک کو بھی اڑا دینا چاہیے
اک تیز رعد جیسی صدا ہر مکان میں
لوگوں کو اُن کے گھر میں ڈرا دینا چاہیے(۳۰)

ان تمثالوں میں جہاں دیومالائی داستانوں سے استفادہ کیا گیا ہے وہاں یہ اشعار قرآن حکیم کی اُن آیات کی تفسیر بھی معلوم ہوتے ہیں جن میں انسان کو اُس کے استحصالی اعمال کے انجام سے دوچار دکھایا گیا ہے۔ منیر نے تاریخ کے تسلسل اور شکست و ریخت کا جس زاویے سے مطالعہ کیا ہے، اُس میں

بھی قرآنی طرزِ فکر کا عکس ہے اور وہ اُن ویرانوں کی تمثالیں تراشتا ہے جو اپنے عصر میں پرشکوہ مناظر تھے:

سن بستیوں کا حال جو حد سے گزر گئیں
اُن امتوں کا ذکر جو رستوں میں مر گئیں
صرصر کی زد میں آئے ہوئے بام و در کو دیکھ
کیسی ہوائیں کیسا نگر سرد کر گئیں
کیا باب تھے یہاں جو صدا سے نہیں کھلے
کیسی دعائیں تھیں جو یہاں بے اثر گئیں(۴۱)

---

ہے بابِ شہرِ مردہ گزر گاہِ بادِ شام
میں چپ ہوں اس نگر کی گرانی کو دیکھ کر(۴۲)

منیر نیازی کا تمثالی اسلوب اپنے تنوع، وسعت اور ہمہ گیریت کے باعث اُردو غزل میں تجربات اور تبدیلی کے ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ حمد و نعت کا آہنگ مزاحمت ورثا کا امتزاج بھی غزل میں ایک خاص تہذیبی تبدیلی کا پیش خیمہ ہے جس کے اثرات نئے شعرا کی غزل میں نمایاں دیکھے جا سکتے ہیں۔

متنوع تمثالوں اور مذہبی طرزِ احساس کے علاوہ منیر کے ہاں اسلوب کا ایک بالکل نیا پہلو جو اس سے پہلے غزل میں شاذ ہی دیکھا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ منیر کے اشعار پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی داستان گو اپنے احوالِ واقعی بیان کر رہا ہے۔ ان واقعات سے کوئی کہانی تو تشکیل نہیں دی جا سکتی لیکن اُردو غزل میں بیانیہ اسلوب کے امکانات بڑے بھرپور انداز سے سامنے آتے ہیں۔ منیر کے اشعار میں داستان گوئی کا رنگ بھی ہے لیکن بیانیہ اسلوب اُن اشعار میں زیادہ جاذب ہے جن میں خبر یا اطلاع کا تاثر ہے یا فرد کے ساتھ پیش آنے والے کسی واقعے کا بیان ہے۔

☆☆☆☆☆

# حوالہ جات


(۱) منیر نیازی، کلیاتِ منیر، لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۸۸ء، ص ۸۱

(۲) ایضاً، ص ۴۱

(۳) منیر نیازی، انتظار حسین سے گفتگو، ملاقاتیں، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۸

(۴) کلیاتِ منیر، ص ۳۰

(۵) ایضاً، ص ۴۰ (۶) ایضاً، ص ۳۳ (۷) ایضاً، ص ۴۴

(۸) ایضاً، ص ۶۴ (۹) ایضاً، ص ۷۵ (۱۰) ایضاً، ص ۹۰

(۱۱) شمس الرحمٰن فاروقی ۔ اثبات و نفی، دہلی: مکتبہ جامعہ، ص ۵۵

(۱۲) کلیاتِ منیر، ص ۷۸

(۱۳) ایضاً، ص ۹۹ (۱۴) ایضاً، ص ۸۹ (۱۵) ایضاً، ص ۱۰۱

(۱۶) ایضاً، ص ۸۷ (۱۷) ایضاً، ص ۷۸

(۱۸) انیس ناگی، آٹھ غزل گو (مرتبہ جاوید شاہین) مکتبہ میری لائبریری (بار دوم) ۱۹۸۸ء، ص ۱۵

(۱۹) کلیاتِ منیر، ص ۹۵

(۲۰) ایضاً، ص ۸۷ (۲۱) ایضاً، ص ۱۳۶ (۲۲) ایضاً، ص ۱۲۵

(۲۳) ایضاً، ص ۱۱۵ (۲۴) ایضاً، ص ۸۱

(۲۵) سہیل احمد خان، طرفیں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء، ص ۶۹

(۲۶) منیر نیازی، انٹرویو فلمی مجلہ شمع، لاہور، ص ۴۵

(۲۷) کلیاتِ منیر، ص ۸۷

(۲۸) ایضاً، ص ۱۷۵

(۲۹) فتح محمد ملک، تعصبات، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص ۳۴۹

(۳۰) کلیاتِ منیر، ص ۶۷

(۳۱) ایضاً، ص ۷۵ (۳۲) ایضاً، ص ۳۸


❁ ❁ ❁